یحییٰ سے پسند کروانے کے بعد خریداری کی۔ گھر کا نام "بیت الحمد" رکھنے کی نیت تھی۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن ان سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی باتیں سن کر کہنے لگے: بابا! ہمیں بھی جانے کا شوق ہے۔ کہنے لگے: اس سال تو گھر مکمل کریں گے۔ ان شاءاللہ اگلے سال ہم سب حج کرنے جائیں گے اور آپ کا شوق پورا کریں گے۔ مگر گھر کی تکمیل سے پہلے 2 جنوری 2014ء بروز جمعرات حقیقی گھر جنت الفردوس میں منتقل ہو گئے، ان شاءاللہ۔

عمر کے بیس سالہ فرق کے باوجود الحمدللہ ہماری بلا کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ میری ہر خواہش کی تکمیل کو اپنا فرض سمجھتے۔ میں غمزدہ ہوتی تو ان کا کندھا غم ہلکا کرتا۔ کوئی راز، کوئی دل کی بات کرنا ہوتی تو وہ میری "سہیلی" ہوتے۔ عقیدے یا عمل میں کوئی غلطی کرتی تو "بزرگ"۔ علمی مشکل درپیش ہوتی تو "استاذ"۔ غصہ کا اظہار کرنے کے بعد معافی مانگتی تو انتہائی فراخ دلی سے کہتے: "پتہ ہے آپ کا غصہ بھی پیارا ہوتا ہے؛ مجھے جوابی غصہ نہیں آتا۔ اس لیے معافی نہ مانگا کریں۔" کہا کرتے: آپ سے شادی کر کے اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا میں ہی جنت دی ہے۔ دو شہزادے ہیں۔ تیسرا شہزادہ محمد عبیداللہ یحییٰ 29 اپریل 2011 کو 12 دن کی عمر میں وفات پا گیا، تو کہنے لگے: اللہ کی امانت تھی، واپس لے لی۔ ہمیں صبر سے کام لینا ہے؛ کیونکہ اصل صبر تو پہلی چوٹ پر ہوتا ہے۔ پہلی بیوی کی آخری بیٹی ضیاء عزیز آٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئی تھی۔ دونوں بہن بھائی اللہ سے سفارش کر کے جنت الفردوس میں لے گئے ہوں گے، ان شاءاللہ۔ وہ کہتے: ہم ان شاءاللہ جنت میں بھی اکٹھے ہونگے، باغاتِ جنت کی سیر کریں گے، ان شاءاللہ۔ میری پسند پیار تک محدود نہیں، میری خواہش تیرے ساتھ جنت پانے کی ہے۔ "رضیہ جی! آپ پریشان نہ ہوا کریں، میں آپ کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔" ان کے یہ الفاظ روکر دل کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کرنے دیتے۔ ساتھ گزرا ہوا عرصہ دس سال میری حاصل حیات ہے؛ اسی میں میری تربیت اور ذات کی تکمیل ہوئی۔

تیری چاہت نے مری ذات مکمل کر دی　　　تو میرے ساتھ رہے گا مرے سانسوں کی طرح

اللہ تعالیٰ نے دو پھول عطا فرمائے ہیں۔ اللہ انہیں کھلتا رکھے، دو جگنو عطا فرمائے ہیں جو شبِ ہجر میں جگمگا کر زندگی کی روشنیاں دکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت کر کے دونوں کیلئے صدقہ جاریہ بنانے کی توفیق دے۔ (آمین)

شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا　　　اک روشن دماغ تھا نہ رہا

صریر خامہ تبصرہ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

تالیف: مولانا عبدالقیوم حقانی- جزاہ اللہ خیراً تبصرہ: ابومحمد عبدالوہاب خان

ناشر: القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد، نوشہرہ KPK ضخامت: 215 صفحات

خلاصہ سیرتِ ابوالکلامؒ: محی الدین احمد فیروز بخت بن مولانا خیرالدین ۹/۸ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ = 1888ء کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، جہاں والد محترم نے سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ آپؒ کی والدہ حجاز کے مشہور علوی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور فصیح اللسان مبلغہ تھیں۔ والد صاحب کنبے کو لے کر کلکتہ آئے، اس وقت ابوالکلام کی عمر آٹھ سال تھی۔ اور یہیں والدہ کا انتقال ہوا۔ والد صاحب واپس مکہ نہ جاسکے اور وہاں کے کاروبار کے لیے متبادل انتظام کرلیا۔

آپؒ کا خاندان دینی علوم و معارف اور تصوف و مشیخت کا مرجع تھا۔ اس طرح آپ کو عوام الناس کی اندھی عقیدت ورثے میں ملی تھی۔ آپؒ ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں: ''میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ طبیعت میں انقباض اور توحش رہتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہوجاؤں۔ اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔''

تعصب کی قید سے رہائی اور تحقیق کی آزادی کا سفر: مولانا حقانی صاحب نے مختصراً لکھا ہے:

''مولانا آزادؒ کا خاندان کی روایت پرستی اور بدعت نوازی کی زندگی سے نکلنا، تمام افکار و اعمال میں سلف کرامؒ کی پیروی اور تمسک بالکتاب والسنہ مولوی محمد یوسف جعفریؒ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا۔'' (ص ٦٦)

الترات: زندگی کا یہ مبارک مرحلہ عقل و فہم سے مزین انسان کے لیے اعتقاد و عمل اور فکر و نظر کا نقطہ عروج ہے۔ فاضل مصنف خود بھی معاصر علماء میں اس جنس گرانمایہ کی نایابی کا شکوہ کرچکے ہیں۔ (دیکھیے: والد کا پیغام صفحہ ۸۴)

مولانا ابوالکلامؒ کی قید تقلید سے رہائی اور عالم تحقیق کی طرف تشریف آوری کی روئیداد کا کچھ حصہ **الترات** 41/38-43 میں آچکا ہے۔ اس اقتباس کو بھی زیر تبصرہ کتاب میں شامل کیا جائے، تو اس کو اختصار کے باوجود جامعیت کی صفت سے چار چاند لگ جائیں گے۔

''تحقیق'' سے ہماری مراد تعصب کو چھوڑ کر ''تلاش حق'' کی مخلصانہ کوشش کرنا ہے۔ یعنی تمام اختلافی مسائل میں

رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین مسلک کی تلاش اور اسی "اسوۂ حسنہ" کی پیروی۔ اس پرخلوص کوشش میں مولانا آزادؒ سمیت کسی متقدم ومتأخر فقیہ یا عالم کی شخصیت پرستی کی کوئی گنجائش نہیں؛ کیونکہ یہ اتباع حق میں رکاوٹ ہے۔

مخلص محقق کو تمام اسلاف کرامؒ، علمائے دینؒ وفقہائے شریعتؒ سے درجہ بدرجہ محبت وعقیدت ہوتی ہے؛ لیکن اس کا دل ودماغ معمور وبھرپور ہوتا ہے تو صرف اور صرف سید ولد آدم، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین ﷺ کی محبت وعقیدت سے۔ اس کو یہ توفیق الٰہی نصیب ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سامنے آئے تو اس کے مقابلے میں کسی بھی امام وفقیہ کی طرف التفات نہ کرے؛ بلکہ وہ اس شعر کا مصداق ہوتا ہے:

مصور! کھینچ وہ نقشہ کہ جس میں یہ صفائی ہو   اُدھر حکم الٰہی ہو؛ اِدھر گردن جھکائی ہو

تحقیق کی ایک مثال: مولانا حقانی صاحب لکھتے ہیں: "مولاناؒ اگر سفر میں ہوتے یا کسی میٹنگ میں شریک ہوتے تو "جمع بین الصلاتین" کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس پر گفتگو ہوئی تو فرمایا: "امام بخاریؒ تو بلا کسی وجہ کے بھی جمع بین الصلاتین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ میں صرف عند الضرورت ہی اس پر عمل کرتا ہوں۔" (صفحہ:۹۳)

التراث: اصحابِ تقلید کی خدمت میں گزارش ہے کہ بلاشبہ ہم امام ابوحنیفہؒ کی امامت وفقاہت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ، اوزاعیؒ، لیثؒ، ابن المبارکؒ، بخاریؒ وغیرہ ہزاروں علماء وفقہاء نے بھی رشوت یا سفارش سے منصبِ امامت حاصل نہیں کیا ہے؟! انہوں نے بھی خلوص سے علوم نبوت حاصل کیے ہیں اور اعمالِ صالحہ سے اپنے علمی رسوخ کو جلا بخشی ہے؟!

لہٰذا جن مسائل پر اجماع امت ہے، وہ یقیناً حق ہیں۔ اور جن مسائل میں علماء کا اختلاف ہے، ان میں سے صرف ایک قول "حق" ہے؛ باقی سب "اجتہادی غلطیاں" ہیں۔ اگرچہ حسنِ نیت کے ساتھ اجتہاد کی وجہ سے اللہ پاک انہیں ان غلطیوں پر بھی اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔ لیکن اتباع شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم "اسوۂ حسنہ" کی پیروی کی نیت سے ہر قسم کے تعصب سے توبہ کر کے قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں موجود **"اکلوتے حق"** کو تلاش کریں۔ اور اسی کو اپنا عقیدہ، عمل اور اخلاق بنا کر رب العالمین کے مخلص اولیاء میں شامل ہوں۔

اس لازمی تمہید کے بعد مذکورہ بالا مسئلے میں دو باتیں قابل تحقیق ہیں:

{1} امام بخاریؒ کا بلا عذر شرعی جمع بین الصلاتین کا قائل ہونا

{2} امام صاحبؒ کے قائل ہونے یا نہ ہونے سے قطع نظر "جمع بین الصلاتین" کی شرعی حیثیت

''جمع بین الصلاتین'' کے قائل حضرات حدیث عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے استدلال کرتے ہیں۔ اور یہ بات مسلمہ ہے کہ ''فقه البخاريؒ في تراجم أبوابه'' پس یہ حدیث صحیح بخاری میں تین جگہ وارد ہوئی ہے:

(۱) كتاب مواقيت الصلاة باب ۱۲ (تأخير الظهر إلى العصر) ح: ۵۴۳ یعنی: ''ظہر کی نماز سے فارغ ہونے پر عصر کا وقت ہو گیا۔'' جیسا کہ راوی حدیث کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

(۲) كتاب مواقيت الصلاة باب ۱۸ (وقت المغرب) ح: ۵۶۲ یعنی: ''مغرب کی نماز کا وقت عشاء تک طویل ہے۔'' اگر وقت تنگ ہوتا تو عشاء تک تاخیر کیسے ہو سکتا؟!

(۳) كتاب التهجد باب ۳۰ (من لم يتطوع بعد المكتوبة ح: ۱۱۷۴) امام بخاریؒ کا استدلال اس باب میں یہ ہے کہ: ''اس موقع پر ظہر اور مغرب کے بعد کی سنتیں نہیں پڑھی گئیں۔''

اس حدیث کا لفظ ہے: ''**صليت مع رسول الله ﷺ ثمانيا جميعا وسبعا جميعا**'' **قلت يا أبا الشعثاء! أظنه أخر الظهر وعجل العصر وأخر المغرب وعجل العشاء ؟! قال: وأنا أظنه**'' [ح:۱۱۷٤] ''عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آٹھ رکعات اور سات رکعات اکٹھے پڑھیں۔'' ابن عباسؓ کے شاگرد ابو الشعثاء جابر بن زیدؒ نے عمرو بن دینارؒ کو یہ حدیث سنائی تو عمروؒ نے کہا: میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز آخری وقت میں اور عصر اول وقت میں پڑھی، اور عشاء کی نماز اول وقت میں اور مغرب کی آخری وقت میں پڑھی؟ تابعی ابو الشعثاءؒ نے جواب دیا: ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

{2} جمع بین الصلاتین کا شرعی حکم

حج کے موقع پر عرفات اور مزدلفہ میں ''جمع تقدیم اور تاخیر'' رسول اللہ ﷺ سے یقینی طور پر ثابت ہے۔ اس کے علاوہ ''جمع بین الصلاتین'' میں علماء وفقہاء کا اختلاف ہے۔

سوال: ابو الشعثاءؒ اور عمروؒ نے اس خیال پر اتفاق کیوں کیا کہ حدیث ابن عباسؓ میں ''جمع صوری'' مراد ہے؟

جواب: اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۝﴾ [النساء ۱۰۳]
''بیشک نماز اہل ایمان پر وقت مقررہ میں فرض کی گئی ہے۔''

جب حدیث ابن عباسؓ میں رسول اللہ ﷺ کی مستقل عادت اور متواتر احادیث کے برخلاف ایک مرتبہ سفر، بارش یا خوف وغیرہ کسی شرعی عذر کے بغیر دو نمازوں کو جمع کرنے کا ثبوت ملا، تو یہاں استدلال کے کئی راستے ہو سکتے تھے:

(۱) اس حدیث کو مذکورہ بالا آیت کریمہ اور دیگر متواتر احادیث کا ناسخ قرار دیا جائے۔ اس صورت میں اوقاتِ نماز کی پابندی کا حکم "سنت" جیسا رہ جائے گا۔ اور بلا عذر شرعی جمع بین الصلاتین درست ہوگا۔ اسی پر شیعہ اثنا عشریہ کا مستقل عمل ہے۔ ہرگز ممکن نہیں کہ امام بخاریؒ تو کجا، کسی بھی اہل علم نے یہ موقف اختیار کیا ہو۔ خصوصاً امام بخاریؒ کے عنوانِ باب سے جمع تقدیم کی مخالفت صاف واضح ہے۔

(۲) راوی حدیث کی اس توجیہ کو قبول کرلیا جائے کہ یہ "جمع صوری" تھی۔ امام بخاریؒ کے تراجم ابواب سے اسی توجیہ کا رجحان محسوس ہوتا ہے۔ نیز اسی توجیہ کی وضاحت میں صحیح وصریح مرفوع روایت بھی ثابت ہے:

عن ابن عباسؓ قال: "صليتُ مع النبيِّ ﷺ بالمدينةِ ثمانيًا وسبعًا جميعًا، أخّرَ الظهرَ وعجّلَ العصرَ، وأخّرَ المغربَ وعجّلَ العشاءَ" [النسائي الصلاة باب ٦٩ "الوقت الذي يجمعُ فيهِ المسافرُ بينَ المغربِ والعشاءِ" ١/٢٨٧-٢٨٨ وصححه الألباني في صحيح السنن ح:٥٩٥،٥٩٦]

(۳) بعض علماء کرام "جمع صوری" پر "اعتراضات کی بوچھاڑ" کرتے ہوئے حدیثِ ابن عباسؓ کو "جمع حقیقی" پر محمول کرتے ہیں۔ پھر عذر کی صورت میں جمع کو "بالأولى" جائز قرار دے کر "جمع تقدیم" پر باقاعدہ عمل کرتے ہیں۔ (جمع صوری پر اعتراضات اور ان کے جوابات کے لیے دیکھیے: التراث 33/16-17)

راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "بلا عذر شرعی" جمع حقیقی مطلقاً ثابت نہیں۔ البتہ حدیث ابن عباسؓ کے مطابق بغیر کسی عذر کے بھی "جمع صوری" کی جائے تو جائز ہے؛ بشرطیکہ اسے عادت نہ بنائی جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں صرف ایک دن "رفع حرج" کی خاطر اس طرح جمع فرمایا ہے۔

سفر میں حسب ضرورت "جمع بین الصلاتین" کرنا درست ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ [صحيح البخاري كتاب تقصير الصلاة باب ١٣ ح:١١٠٦-١١٠٨] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ جمع بین الصلاتین کو بغیر ضرورت "قصر" کی طرح مستقل اختیار کرنا سنت کے خلاف ہے۔ [مجموع الفتاوى ٢٤/٦٤]

بارش کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ اس مسئلے میں تفصیل کے لیے دیکھیے: [التراث 32/10-21، 33/12-23]

لہٰذا مولانا ابوالکلامؒ اور ان کے بقول امام بخاریؒ کی جمع بین الصلاتین کو "جمع صوری" سمجھنا چاہیے۔ واللہ أعلم

اگر بالفرض امام بخاریؒ یا کسی اور عظیم شخصیت سے بلاعذرِ شرعی جمع تقدیم کرنا ثابت ہوجائے، تب بھی تتبع سنت کے

لیے ان کی تقلید کرنا حرام ہے۔ سنی کا دین شرعی دلائل کا موازنہ کر کے صحیح تر قول کو اختیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام علمائے دین کو تعصب کی قید سے رہائی پانے اور اخلاص کے ساتھ سنت مطہرہ کی اطاعت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

نوکر کی عزت: باورچی کی توہین کے ردِعمل میں مولاناؒ نے رشتہ دار کا تحفہ تک واپس کر دیا۔ (صفحہ ۹۸-۹۹)

الترات: اگر ہمیں ایسا موقع آئے تو مولاناؒ کی طرح یک طرفہ کارروائی کے بجائے مصالحت کی کوشش کرنا ہی بہتر لگتا ہے؛ کیونکہ ''صلہ رحمی'' بھی ایک اہم شرعی فریضہ ہے۔

زبان کی حفاظت: مجلس احرار اسلام کے رہنما حسام الدینؒ کے ساتھ ایک مجلس میں کسی نے قائداعظم کے متعلق اخلاقی معیار سے کمتر جملہ کہا، تو غصے میں اٹھ کر نکل گئے۔ (۱۱۱-۱۱۲)

مولاناؒ کہتے: ''جو اصولوں کے بجائے آدمیوں سے لڑتے ہیں، وہ اپنے افکار و نتائج کو خود گزند پہنچاتے ہیں۔'' (۱۱۳)

''سیاست میکدے کی طرح ہے کہ جام ہی نہیں ٹکراتے، عمامے بھی اچھلتے ہیں۔ مخالفوں کو جواب دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انہیں تسلیم کر لیا۔ اور یہ عشق مقصد کی نفی ہے۔'' (۱۱۳)

مسلم لیگ مولانا کے خلاف گالی گفتار کی انتہا پر پہنچی۔ ترجمان احرار اور روزنامہ آزاد بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگے تو کہا: ''لیگ کی اپنی زبان ہے، اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیے۔ اگر سب و شتم بھی زبان ہے، تو قومی اخلاق کا اللہ حافظ ہے۔ لوگ جو کہتے ہیں کہنے دو، انہیں شاید حق پہنچتا ہے؛ لیکن اپنی زبان کو آلودۂ دشنام نہ کرو۔'' (۱۱۴-۱۱۵) ''طعن و طنز کمزور انسانوں کی بیمار زبانوں کی ہذیان ہیں۔'' (۱۱۵)

1946ء کے انتخابات میں مولانا مظہر علی مظہر کی تقریر سے مولانا ابوالکلامؒ پریشان ہو گئے، جس میں قائداعظم کو کافرِ اعظم کہا اور ان کے نکاح کا قصہ چھیڑا تھا۔ مولاناؒ نے فرمایا: ''یہ سیاسی لڑائی نہیں، ایک ایسی مبتذل بات ہے جو الفاظ کی رعایت سے کھٹی تے ہے۔'' تین دفعہ اِنَّا لِلّٰهِ پڑھ کر فرمایا: ''مولوی صاحب! آپ بازی ہار گئے ہیں۔'' (۱۱۵-۱۱۶)

''میں نے لوگوں کے عیب چننے کے بجائے ہمیشہ ان کی خوبیاں تلاش کی ہیں۔ جو لذت حسن تلاش کرنے میں ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ محاسن کی ڈھونڈ ہی سے آدمی اپنے محاسن کو بڑھا اور چمکا سکتا ہے۔'' (۱۱۸) **سبحان اللّٰہ!**

بوالکلامؒ کی بوالکلامی: مولاناؒ کی تقریر سننے والے کہا کرتے تھے: ''مولانا تقریر نہیں، جادو کرتے ہیں۔'' (۱۳۱)

مولانا حسرت موہانیؒ نے آپؒ کے بارے میں فرمایا:

جب سے دیکھی بو الکلامؒ کی نثر نظمِ حسرتؒ میں کچھ مزا نہ رہا (۲۱۱)

انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے میں پہلی بار خطاب کیا تو مولانا حالیؒ، ڈپٹی نذیر احمدؒ اور علامہ شبلیؒ ہکا بکا رہ گئے۔ ڈپٹی صاحبؒ نے کہا: ''تقریر خوب رٹی ہوئی ہے۔'' ان ریمارکس پر مولانا آزادؒ نے اعلان کیا کہ ڈپٹی صاحب جو عنوان تجویز فرمائیں، اسی اجلاس یا اگلے اجلاس میں اس موضوع پر تقریر کروں گا۔ مولاناؒ نے تجویز کردہ عنوان پر تقریر کی تو مجمع لوٹ پوٹ ہوگیا۔(۱۳۶) سبحان اللہ!

دس بارہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے اور ''گلدستہ نیرنگِ عالم'' جاری کیا۔ بعد میں مولاناؒ نے محسوس کر لیا کہ شاعری ان کی حقیقی جولان گاہ نہیں ہے۔(۱۶۲) ابوالکلام کی ایک نعت:

اعجازِ مصطفیٰ ﷺ کے ہوئے دل سے معتقد — باطل فسوں گروں کی جو افسوں گری ہوئی
حسنِ حبیبِ حق کی تجلی کے روبرو — تاریک تر ضیاءِ مہ و مشتری ہوئی
آزاد وصفِ نورِ نبی ﷺ جب رقم کیا
شہرت زمانے میں صفتِ انوری ہوئی (۱۷۰)

میدانِ صحافت میں: اواخر 1900 یا اوائل 1901ء میں مولانا کی زیرِ ادارت ''**المصباح**'' شائع ہوا۔ اس کے بعد تیرہ برس کی عمر میں ''**نیرنگِ عالم**'' جاری کیا۔ پھر نومبر 1903ء میں ''**لسان الصدق**'' جو اس وقت کا معیاری رسالہ تھا، یہ 1905ء میں عراق جانے پر بند ہوا۔ اکتوبر 1905ء میں علامہ شبلی کے اصرار پر ''**الندوۃ**'' کی ادارت سنبھالی، یہ الندوہ کا دورِ زریں کہلاتا ہے۔ پھر مارچ 1906ء میں ''**اخبار وکیل**'' امرتسر کی ترتیب کی۔ وکیل اخبار کی ایڈیٹری کے دوران مولاناؒ کے بڑے بھائی مولانا غلام یاسین آہ دہلوی کا انتقال ہوا، ان کو والد ماجد نے کلکتہ آنے کا حکم دیا۔ یہاں آپؒ نے آٹھ ماہ تک اخبار ''**دار السلطنت**'' کی ادارت سنبھالی۔ جب مالکِ اخبار کی پالیسی میں دخل دینے لگا تو آپؒ اس سے الگ ہو کر دوبارہ **اخبار وکیل** سے وابستہ ہو گئے۔(۱۵۱-۱۵۴)

اس دوران مولانا آزادؒ کے سیاسی خیالات میں تبدیلی آئی اور چھ برس کی جستجو کے بعد 13 جولائی 1912ء کو ذاتی اخبار ہفت روزہ ''**الھلال**'' جاری کیا۔ اس میں انقلابی خیالات اور آزادی کی لہر پیدا کی۔

سیاسی زندگی: کہتے تھے ''کم از کم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اس حق کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں کہ پورے ہندوستان کو میدانِ عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور معاشرتی تشکیل میں شرکت کروں۔''(۱۵۶)

مولانا آزادؒ کانگریس کے سرگرم رکن رہے۔ آپ نے انگریزوں کے خلاف سیاسی مقدمات میں کافی عرصہ جیلوں

میں گزارا۔ آپ کے عدالتی بیانات دلیرانہ اور فیصلہ کن تھے۔(۱۰۳-۱۰۴)

ایک عدالتی بیان: "میں نے 1920,21ء کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں۔ یقیناً میں نے کہا ہے کہ گورنمنٹ ظالم ہے، گورنمنٹ نا انصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ بری چیز کو یا درست ہو جانا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ مسٹر مجسٹریٹ! جلدی فیصلہ لکھتے جاؤ، یہاں تک کہ عدالتِ الٰہی کا دروازہ کھل جائے۔ اور اسی کا فیصلہ آخری ہوگا۔"(۱۰۶-۱۰۷)

انگریزوں کے خلاف سیاسی بیانات پر "ایک سال قید با مشقت" کا فیصلہ سن کر کہا:

"میں جس سزا کا متوقع تھا، اس سے تو یہ بہت ہی کم ہے۔"(۱۰۵)

مولانا استخلاصِ وطن کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ یلغار سے برطانوی اقتدار کی جڑیں اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ برطانوی ایجنٹوں نے آپ کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کی۔ ایک دفعہ جامع مسجد میں بہت بڑے اجتماع سے خطاب کر کے لوٹ رہے تھے، دہلی کے ایک مشہور بدمعاش نے بڑی بدزبانی کی۔ عقیدت مندوں نے اس کو عبرتناک سزا دینا چاہی۔ مولانا نے انہیں ڈانٹا۔ گالیاں سن کر آپ مسکراتے رہے اور وہ "قشقہ لگالو......قشقہ" کہتے ہوئے چلا گیا۔ آپ نے کہا: "آپ حضرات اس غریب پر کیوں خفا ہوتے ہیں؟ اصل مخالف کو پہچان لو۔ کوئی شخص کتے پر اینٹ پھینکے، تو کتا اینٹ پر نہیں جھپٹتا، اس ہاتھ پر جھپٹتا ہے۔ جانتا ہوں کہ ننھے خان کو بھیجنے والا کون ہے۔ اسی سے میری جنگ ہے۔"...... بعد میں ننھے خان نے آپ سے معافی مانگی اور کہا: حضور! مجھے بہکایا گیا تھا۔(۱۰۷-۱۰۹) (قشقہ: جبین ہندو پر نشانِ صندل)

قید، تصنیف و تالیف اور دینی خدمات: 8 جولائی 1916ء تا دسمبر 1919ء انگریز حکومت نے رانچی میں نظر بند کر دیا تو مولاناؒ نے جیل کی تنہائی کو تصنیف و تالیف کے لیے غنیمت جانا۔ لوگ یہاں دیوانہ وار ملاقات کے لیے آتے تھے۔ (۱۷۳-۱۷۴) یہاں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا، ہندوستان کے مشاہیر علماء کو بلا کر افتتاحی جلسہ منعقد کیا۔ اپنی کتاب "تذکرہ" لکھی۔(۱۷۵) رانچی میں چار سالہ نظر بندی کے دوران نمازِ جمعہ کے بعد خطبہ دیتے جس میں بکثرت لوگ جمع ہوتے تھے۔ بعض تاجروں نے نقصان برداشت کر کے شراب کی تجارت بند کر دی۔ یہاں حنفی اور وہابی کا جھگڑا تھا۔ مولاناؒ نے اس مسئلے پر رانچی کی مسجد میں متعدد خطبے دیے۔ اور کچھ لوگوں نے آپ کو وہابی اور غیر مقلد کہا؛ لیکن یہ فتنہ بھی جلد دب گیا۔(۱۷۶)

رانچی کی مذہبی حالت نہایت ابتر تھی۔ لیکن مولاناؒ کی کوششوں نے چند ہی سالوں میں وہاں کی زمین و آسمان کو بدل دیا۔ وہاں اسلامی انجمن بنی۔ مدرسہ اسلامیہ قائم ہوئی۔ جہاں ایک عالم دین کا وجود نہ تھا، وہاں اب کوششیں ہو رہی ہیں کہ سینکڑوں

علمائے دین اسی کی خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں۔ جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں، وہاں ایک خورشید سے دیر وحرم سب میں اجالا ہو گیا۔ علوم نبوت کی ترویج واشاعت کی بہار آئی۔ یہاں ایک سال تک جامع مسجد میں قرآن مجید کا درس دیا۔ "ترجمان القرآن" کا مؤثر تفسیری ترجمہ اسی زمانے میں مکمل ہوا۔ "البیان" تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب وسنت کی روشنی میں متعدد رسائل ترتیب دیے۔ سوانح مجددین کے سلسلے میں علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن القیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے سوانح ومجتہدات قلمبند کیے۔ (۱۷۶-۱۷۷)

10 دسمبر 1921ء کو پھر گرفتار کیے گئے اور 9 فروری 1922ء تک صرف آٹھ پیشیاں ہوئیں، جس میں "قول فیصل" کے نام سے تحریری بیان داخل کیا۔ جو کہ تحریک خلافت کے اسباب ومقاصد پر مستند ترین بیان ہے۔

اس وقت آپؒ نے فرمایا: "تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں۔" اس موقع پر آپؒ کو ایک سال قید کی سزا دی گئی۔

تیسری گرفتاری سول نافرمانی کی پاداش میں ہوئی۔ میرٹھ جیل میں چار ماہ رہے۔ آپؒ کی آمد کے بعد جیل کا سنگدل داروغہ کسی حد تک سدھر گیا؛ کیونکہ مولاناؒ جیل کے کسی قیدی کے ساتھ جیل اتھارٹی کی کسی سختی کو برداشت نہ کرتے تھے۔ پھر گونڈا جیل بھیج دیے گئے، جس کا سپرنٹنڈنٹ کرنل رحمان آپؒ کا بہت احترام کرتا تھا۔ جیل میں کوئی بڑا ہندوستانی یا انگریز افسر ملنے آتا اور مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تو مولاناؒ یا تو بہت کم بات کرتے یا اس کا جواب اردو میں دیتے تھے۔ (۱۸۰)

یہاں ایک دفعہ انگریزی اخبار پانیر کا مطالعہ کرنے لگے۔ پوچھنے پر بتایا: "انگریزی کی ضرورت تو رہتی تھی۔ میں نے ایک بنگالی دوست سے A, B, C سیکھ لی تھی۔ پھر بائبل کو اردو ترجے اور ڈکشنری کی مدد سے پڑھا تو انگریزی آ گئی۔ (۱۸۱)

جیل کے صحافی ساتھی مولوی اسماعیل ذبیحؒ کہتے ہیں: ہم رات کو اپنی اپنی بارکوں میں بند ہوتے تو ڈرامے کھیلتے اور ہنسی کا طوفان کھڑا کرتے۔ جیل افسران کی شکایت پر مولاناؒ نے کہا: "سیاسی قیدی اگر اپنی میعادِ قید کو ہنسی میں نہ اڑائیں تو کیا کریں!" ایک دفعہ شرارتاً رونے کی بازی لگ گئی۔ کہرام بپا ہوا تو جیل حکام بھاگے ہوئے آئے۔ جب انہیں ان کی بے پروا شرارت کا اندازہ ہوا، تو دوسرے دن مولاناؒ سے شکایت کی۔

اس بار مولاناؒ نے مداخلت کی اور کہلا بھیجا: "دشمن کی قید میں ہنسی میں بھی رونا اچھا نہیں۔" (۱۸۳)

9 اگست 1942ء کو بمبئی میں آخری گرفتاری ہوئی اور قلعہ احمد نگر میں رکھے گئے۔ اس قید وبند کے حالات مشہور کتاب "غبارِ خاطر" میں تفصیل سے لکھے ہیں۔

اس بیان سے مولاناؒ کے صبر و شکر کا اندازہ کیجیے: ''جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں! اسے ''قید خانہ'' ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے!''(۱۸۵)

سیاسی موقف: جب تحریک پاکستان چلی تو ان کا موقف یہ تھا: ''ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے، جو پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں گے۔ وہ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پسماندہ ہوں گے۔ اور ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے جو خالص ہندو راج بن گئی ہوگی۔ اور مسلمان اپنے آپ کو اجنبی اور پردیسی سمجھیں گے۔ رہی یہ بات کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی، یہ وہم و گمان ہے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں مسلمان دوسرے درجے کے شہری ہوں گے۔''

التراث: اب تلک ہمارے حکمران مولاناؒ کی پیش گوئی پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ ضیاء الحقؒ نے اس کی تردید کے لیے مثبت رخ پر کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اب اگر نواز شریف اپنی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اسلامی نظام حکومت قائم کر کے مولاناؒ کی پیش گوئی کو غلط ثابت کر دے، تو قوم کے ہیرو بن سکیں گے۔ واللہ ولی التوفیق

تقسیم ملک کے بعد مولاناؒ ہندوستان کے وزیر تعلیم بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپؒ کا یہ جملہ مشہور ہو گیا تھا:

''پاکستان نہ بنتا تو اور بات تھی؛ لیکن اس کا بن کر بگڑنا پورے عالم اسلام کی توہین ہے۔''(۱۵۷)

جب دہلی لٹا اور مسلمانوں کے لیے اس کے کوچہ و بازار شعلہ زار ہو گئے، تو پرانے دہلی کے علاقے میں مارے مارے پھرتے۔ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کے سہارا دیتے، آیاتِ قرآنی سنا کر ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ اپنی کوٹھی کو بعض ایسے خاندانوں کے لیے پناہ گزین کیمپ بنا دیا جو دہلی کے رؤساء میں سے تھے، جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور پاکستان جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔(۱۳۰)

عقدِ زواج: مولاناؒ کا نکاح کم عمری میں ہوا تھا۔ حمیدہ سلطانہ کہتی ہیں: ایک صبح ہم پہنچے، تو بیگم آزادؒ کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا: کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ وہ ہنس کر بولیں: ''آج کل مولاناؒ قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں، رات کو دو بجے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں، میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے، باہر بھی حبس رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں! (۱۹۵)

قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران زلیخا بیگمؒ بیمار ہو کر فوت ہو گئیں۔اس موقع پر برصغیر کی فضائیں اداس ہو گئیں۔سیاسی اختلاف کے باوجود 18 اپریل 1943ء کو کلکتہ میں مسلم لیگ نے تعزیتی جلسہ کیا۔جس میں ابراہیم ہوش نے تعزیتی نظم پڑھی:

آج تک دیکھا نہ ہو گا عالم ایجاد نے
جان دی جس بے کسی میں بیگم آزادؒ نے
باغ پر آئے خزاں اور باغباں ہو قید میں
کارواں لٹ جائے ، میرِ کارواں ہو قید میں
اس کی بیگم جان دے اور وہ سربالیں نہ ہو — یعنی: سرہانے
یا خدا ! ایسی کسی کی موت غم آگیں نہ ہو
مرتے دم بھی اپنے بیگانوں سے جو ملنے نہ دے
یوں کسی کی مملکت میں جبر کا آئین نہ ہو (۲۰۱)

مولانا آزادؒ کو اس موقع پر پیرول پر رہائی مل سکتی تھی؛لیکن آپؒ کی خودداری نے انگریز حکومت کو درخواست دینا گوارا نہ کیا۔(۱۹۱) دوسال بعد بانکوڑہ جیل سے رہا ہو کر کلکتہ پہنچے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔پہلے ان کی قبر پر تشریف لے گئے۔کار پر لدی ہوئی ہاروں میں سے ایک ہار قبر پر ڈال دیا اور خاموشی سے فاتحہ پڑھی۔(۲۰۲-۲۰۳)

حمیدہ سلطان کے بقول ان کی قبر سنگ مرمر سے بنی ہوئی اور اس پر پھولوں کی بیل چھائی ہوئی تھی۔(۲۰۴)

التراث: قبر پر ہار ڈال دینا دلائل شرعی سے قطع نظر ایک جذباتی فیصلہ لگتا ہے؛ کیونکہ وفات کے دو برس بعد زیارت کو پہنچے تھے۔قبر کو سنگ مرمر سے مزین کرنا رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر ممنوع ہے۔یقیناً مولاناؒ کا اس تزئین میں کوئی دخل نہ ہوگا؛لیکن اس بدعت کو مٹا کر قبر کو بالکل سادہ کر لیتے تو آپؒ آئیڈیل رہنما ہوتے،کیونکہ:

ابوالہیاج اسدیؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علیؓ نے فرمایا: ''کیا میں آپ کو وہ ذمہ داری نہ دوں جو اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے سونپ دی تھی؟!''أن لا تدعَ تِمثالاً إلا طمستَه ولا قبرًا مشرفًا إلا سوَّيتَه'' ''کوئی بھی تصویر یا مجسمہ دیکھے اسے مٹا دو اور جو بھی قبر بلند ہوا سے (زمین کے) برابر کردو۔''[صحیح مسلم ۳۶/۷]

مولانا آزادؒ کے زرین اقوال: ''ہندوستان میں اسلام اہل اللہ کی معرفت پھیلا۔جب اکابر رجال اٹھ گئے اور ان کی آخری آرام گاہیں بڑے بڑے روضے بن گئے، تو ان کی اولاد و اخلاف نے شریعت کو پس پشت ڈال کر طریقت کی

دوکانیں قائم کرلیں۔ قرن اول کے اسلام میں تصوف کا وجود ہی نہیں، عربی فکر میں عجمی پیوند لگا ہے۔ خانقاہی سلسلوں کا رنگ ڈھنگ مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کی پیداوار ہے۔" (۱۲۶)

"مناظرہ، علم کا اسراف اور مباحث کی تبذیر ہے۔ اگر اپنے فیصلوں کی سچائی پر یقین ہے تو اس کی پروانہ کرو کہ دنیا تمہارے ارادوں کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔" (۱۱۸)

"عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے۔ ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ اپنے حواس قابو میں رکھو، گردوپیش میں اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کردوں۔ یہ تو دل ہی کی دوکان سے اعمالِ صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہوسکتی ہے۔" (۱۴۰)

"تمہارے قدم میرا ساتھ نہیں دیتے، شاید تمہاری لغت میں فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔" (۱۴۱)

"تلوار کی صداقت کسی عہد میں ضعیف نہیں ہوتی۔ وہ ہاتھ نہایت مقدس ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہے؛ لیکن زندہ وہ رہ سکتا ہے، جس کی مٹھی میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔" (۱۴۲)

"آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں اور ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کرلیں؛ لیکن وہ ایک ثانیہ کیلئے بھی "ایمان" کو شکست نہیں دے سکتیں۔ قدرت جب کسی فرد یا جماعت کو ایمان کی طاقت بخشتی ہے، تو وہ بے پناہ ہوجاتا ہے۔" (۱۴۳)

سفرِ آخرت: بیگم کی وفات کے بعد آپؒ لوگوں سے ملتے، سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہتیں؛ لیکن دل کی دنیا ویران رہی۔ 19 فروری 1958ء کی صبح فالج کا حملہ ہوا اور 22 فروری کو اپنی متاعِ جان' جان آفرین کے سپرد کردی۔ پورے ملک میں کاروبار اور دوکانیں بند ہوگئیں۔ ہندوستان کا قومی پرچم سرنگوں کردیا گیا۔ جنازہ اٹھا تو کنگ ایڈورڈ روڈ کے بنگلہ نمبر 4 سے باہر دو لاکھ سے زائد عوام کھڑے تھے، اور جب جنازہ دریائے گنج پر پہنچا تو پانچ لاکھ افراد ہو چکے تھے۔ کفنا کر پلنگ پر ڈال دیا گیا تو صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور غیر ملکی سفراء نے پھول چڑھائے۔ (۲۰۷)

التراث: یہ "پھول چڑھانا" ہندو حکمرانوں کا عمل تھا، اور ان ہی کے لیے زیبا۔ ہم مسلمانوں کو اپنے پیارے نبی ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے میں ہی بہتری ہے، جس میں پھول چڑھانے کا ثبوت نہیں۔

جب میت اٹھائی گئی تو پہلا کندھا عرب کے سفراء نے دیا۔ جب کلمہ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفراء بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ (۲۰۷)

جنازہ رکھتے ہی کہرام مچ گیا۔ جنازہ ہندوستان کے قومی پرچم میں لپٹا ہوا تھا۔ اور جنازہ پر دہلی کی روایت کے مطابق